ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

کانٹ کی فکر کے بر صغیر کے ادب پر اثرات (ایک تحقیقی مطالعہ)

The Impact of Kantian Philosophy on Postcolonial Literature of the Subcontinent: A Research Study

☆محمد منظر احسان: پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف لاہور، لاہور، پاکستان۔
☆☆پروفیسر ڈاکٹر محمد امین: سابق پروفیسر شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف لاہور، لاہور، پاکستان۔

Abstract:

This research study delves into the profound impact of Kantian philosophy on the literature of the postcolonial era in the Indian subcontinent. Immanuel Kant's philosophical ideas, particularly those concerning autonomy, rationality, and moral agency, have transcended geographical boundaries and permeated various aspects of intellectual discourse worldwide. In the context of the postcolonial experience, Kant's notions of autonomy and self-determination have played a pivotal role in shaping the literary landscape, providing a framework through which writers from the subcontinent have articulated their identities, struggles, and aspirations. The study employs a multidisciplinary approach, drawing on insights from literary theory, postcolonial studies, and Kantian philosophy to analyze the intersections between Kant's ideas and the literary works of authors from the subcontinent. Through close readings of select texts, the research examines how Kant's emphasis on individual freedom and moral responsibility resonates with themes of decolonization, identity formation, and cultural resurgence in postcolonial literature. Furthermore, it investigates how writers have both embraced and challenged Kantian principles, adapting them to address the specific historical and sociopolitical contexts of the subcontinent. The findings of this study shed light on the nuanced ways in which Kant's philosophy has influenced the aesthetics, themes, and ideological underpinnings of postcolonial literature in the subcontinent. By exploring the reception and adaptation of Kantian concepts within literary texts, this research contributes to a deeper understanding of the complex dynamics between Western philosophical thought and indigenous literary traditions. Additionally, it underscores the enduring relevance of Kantian ethics and epistemology in navigating the complexities of postcolonial identity and agency. Overall, this research underscores the enduring relevance of Kantian philosophy in shaping the literary imagination of the postcolonial world, while also highlighting the agency of writers from the subcontinent in critically engaging with and reinterpreting Western philosophical paradigms within their own cultural and historical contexts.

Keywords: Kant, Postcolonial, Literature, Subcontinent, Influence

کانٹ کا تعارف

عمانوئیل کانٹ پروشیا

[1] کے شہر کونگس برگ [1] میں ۲۲ اپریل ۱۷۲۴ء کو دستکاری کے ایک کارخانہ میں پیدا ہوا اس کی ماں بڑی دیانتدار عورت تھی اور

(1) پروشیا جرمنی کی ایک تاریخی ریاست رہی ہے۔ جرمنی کو متحد کرنے اور اس کی ترقی میں اس کا بڑا کردار ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پروشیا کو ختم

Mysticism (تصوف) کے رنگ میں جواُن دنوں جرمنی میں عام تھاڈوبی ہوئی تھی۔اس کی تربیت کے اثر سے کانٹ کے دل میں بچپن ہی سے مذہبی اور اخلاقی احساس بیدار ہو گیا۔جس مدرسہ میں داخل ہوااس کا صدر مدرس 'ف اشلتس' کونگس برگ میںPietistio مذہب تصوف کا علمبردار تھا۔یہاں کانٹ نے مروجہ کلاسیکی تعلیم،مذہبی اور اخلاقی تربیت حاصل کی۔۱۷۴۰ء میں وہ مدرسے کی تعلیم ختم کرکے کونگس برگ یونیورسٹی میں داخل ہوااوراپنی ماں کی خواہش کے مطابق دینیات کی تحصیل کرنے لگا۔(2)

کیونکہ کانٹ لوگ پادری تھے اس لئے ان کی تعلیمات بائبل پر مبنی تھیں وہ جرمن "Pietist Branch of Leutran Church" تحریک تقوی کاایک فرقہ تھے۔(3)امن کے سپاہی کہلاتے تھے۔یہ تھاوہ مذہبی ماحول جس میں عمانوئیل نے گھریلو تربیت اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔سکول کا نصاب بچوں کی ذہنی توانائیوں کی بجائے خاص طور پران کے اخلاق کو ترقی دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔اس کے پادری اساتذہ میں سے ایک کا کہنا تھا کہ میں ایک سو عالم فاضل تیار کرنے پر محض ایک روح کو نجات دلانے کو ترجیح دیتا ہوں۔اس کے خواب وخیال میں بھی نہ ہو گا کہ اپنے سکول میں وہ ایسے اسکالر کو تیار کر رہا تھاجو آگے چل کر لاکھوں روحوں کو روشن کرنے والا تھا۔(4)

جیسا کہ سورج ہوتا ہے۔ہر روز وہ ایک ہی وقت پر اٹھتا،لباس بدلتا،اپنی (Coffee) کافی پیتا،لکھتا،لیکچر دیتا،کھانا کھاتااور سیر کو نکلتا۔سوانح نگاروں نے کانٹ کی وقت کی سخت پابندی کی عادت کا بہت چرچا کیا ہے۔اس کی زندگی شادی کے بغیر ہی گزری تھی۔وہ بمشکل ہی ایسا شخص تھاجو کسی عورت کے سر کورومانوی خیالات سے بھر سکتا ہو۔(5)

خیر جہاں تک خود کانٹ کا تعلق ہے وہ اپنی تعلیم میں ذہنی تربیت پر مذہبی تربیت کو ترجیح دینے کو پسند نہیں کرتا تھا۔وہ مذہب کی زبانی ہدایات اور تقریباتی رسوم کے ختم نہ ہونے والے سلسلے،مذہبی تربیت کے طویل اوقات اور صبح سے رات تک عبادتوں کے مسلسل چکر کو ناپسند کیا کرتا تھا۔بچپن میں رواجی مذہب کے لیے اس کے دل میں جو ناگواری پیدا ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ساری بالغ زندگی میں اجتماعی عبادت میں شریک ہونے سے گریز کرتا رہا۔(6)

بہر حال کانٹ تحریک تقوی کی اخلاقی اقدار سے بے خبر نہ تھا۔ہنری تھامس،کانٹ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے ایک باراس نے کہا تھا:

‘‘Say what you will of this doctrine, no one can deny the sterling worth of the characters which it formed.’’(7)

کر دیا گیا تھا۔

(1) کونگس برگ،پروشیا کادارالحکومت رہاہے۔

(2) عمانوئیل کانٹ، تنقید عقل محض،(مترجم: مقدمہ ڈاکٹر سید عابد حسین)، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۰ء ص ۵

(3) سترہویں صدی کی ایک تحریک جو جرمنی کے لوتھری گرجاگھروں میں شروع ہوئی۔اس میں رسومات کے مقابلے میں ذاتی محسوسات پر زور دیا جاتا تھااس تحریک میں سادگی اور اخلاقی قوانین کی پیروی پر زور دیا جاتا تھا۔

(4) (Thomas, Henry, Living Biographies of Great Philosophers,Perma Giants,New York ,1919,p:192

(5) (Thomas, Henry, Living Biographies of Great Philosophers,Perma Giants,New York ,1919,p:191

(6)(Thomas, Henry, Living Biographies of Great Philosophers,Perma Giants,New York ,1919,p:193

(7)(Ibid,p:193

" آپ اس تحریک کے نظریے کے بارے میں چاہے جو بھی کہیں، لیکن کوئی شخص بھی ان کے پارسا کرداروں کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کرسکتا جو اس تحریک نے پیدا کئیے۔"

بلاشبہ خود کانٹ کی کردار سازی میں اس تحریک نے اہم حصہ لیا تھا۔اس تحریک سے تعلق رکھنے والے کانٹ کے اساتذہ نے اس انسان کو حاصل ہونے والی اعلیٰ ترین شے عطا کی تھی۔وہ شانتی، وہ خوش باش روح اور وہ باطنی سکون و ہم آہنگی جس کو کوئی جذبہ پریشان نہیں کرسکتا۔[1]

کردار سازی پر زور دینے والے اس سکول میں وہ آٹھ سال تک رہا۔بعدازاں وہ کونگس برگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔کالج کے سارے زمانے میں وہ غربت آشنا رہا۔تعلیمی اخراجات اور دال روٹی کے لئے وہ اپنی جماعت کے کمزور طالب علموں کو پڑھاتا۔اکثر اوقات خصوصاً جب تعلیمی اخراجات کی ادائیگی کے دن آتے تو اس کو روٹی کے بغیر گزارہ کرنا پڑتا۔اس زمانے میں کانٹ کا لباس بھی بوسیدہ اور پھٹا پرانا ہوتا۔لیکن اپنے خیالات کی طرح وہ اپنی پتلون کو ہمیشہ استری شدہ رکھتا۔ان تمام ابتلاؤں اور صعوبتوں کے باوجود وہ اپنی صحت کو قائم رکھنے میں بھی کامیاب رہا۔

صحت کے معاملے میں وہ جرمن باریک بینی اور اسکاچ استقلال سے کام لیتا تھا، خاص طور پر جب وہ سرما کے دنوں میں گھر سے باہر نکلتا تو صرف ناک کے ذریعے سانس لیتا اور کسی سے بات چیت نہ کرتا۔اس نے عزم کر رکھا تھا کہ کسی طور بھی نمونیہ کی ہواؤں کو اپنے کھلے منہ کے ذریعے بدن میں داخل نہ ہونے دے گا۔یونیورسٹی میں کانٹ والدین کی عنایت سے داخل ہوا تھا۔والدین کو امید تھی کہ کسی روز وہ کلیسا کا اعلیٰ عہدے دار بنے گا۔جو اس زمانے کے سکاچ دستکاروں کے لئے عملی زندگی کی معراج تھی۔لیکن کانٹ کا معاملہ اور تھا۔وہ فلسفہ کو دینیات پر ترجیح دیتا تھا۔اس زمانے کی کونگس برگ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی بات ہی اور تھی۔دو بہترین جرمن فلسفی پروفیسر نیوٹزن اور پروفیسر ٹیسکے وہاں پڑھاتے تھے۔[2]

جرمنی کی یونیورسٹیوں میں ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ ہر شعبہ کے طالب علم کو عام ذہنی تربیت کی غرض سے فلسفہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔کانٹ کو اپنے اصلی مضمون کے مقابلے میں اس ضمنی مضمون میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔اس نے بہت جلد اس عہد کے درسی فلسفے پر جس کا جزو اعظم (Leibniz) لائبنز[3] اور وولف[4] کا فلسفہ تھا، عبور حاصل کرلیا۔کانٹ کو اپنی یونیورسٹی کے اساتذہ کے زیر اثر نہ صرف مابعدالطبیعیات کی گہرائیوں کو جاننے کا موقع ملا، بلکہ اس نے طبیعیات، جیومیٹری، الجبرا، نفسیات، فلکیات اور منطق کے حقائق کا بھی علم حاصل کیا۔مختصر یہ کہ اس نے اپنے زمانے کی معلوم دنیا کا اختصار سے مگر ہمہ گیر جائزہ لیا۔

جدید فلسفے کا نقطہ آغاز سترہویں صدی کے اوائل میں یورپی عقلیت پرستوں کی فکری تحریروں کے ساتھ شروع ہوا۔ان عقلیت پرستوں کا تعلق فرانس سے تھا اور ساتھ ہی برطانوی تجربیت پسند فلاسفہ نے اس عقلیت پرست فکری نظام کی مخالفت کی اور پھر اٹھارویں

---

(1) Ibid,p:193

(2) Thomas, Henry, Living Biographies of Great Philosophers,p:194

(3) (لائبنز: Leibniz 1646-1716 براعظم یورپ کا تیسرا اہم عقلیت پرست فلسفی ہے جو لیپزگ کا باشندہ تھا۔)

(4) (کرسچین ولف 1679-1754 یہ وہ فلسفی ہے جس نے لائبنز کے فلسفے کو باضابطہ بنا کر منظر عام پر پیش کیا۔)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

صدی میں جدید فلسفے میں عمانوئیل کانٹ کا شمار ایسے ہی اہم اور عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے مغربی دنیا میں فلسفیانہ تفکر کے دھاروں اور دنیا کے بارے میں نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے رکھا دیا۔ اٹھارہویں صدی میں جب برطانوی تجربیت اور عقلیت اپنے حتمی نتائج کی بنا پر بند گلی میں پہنچ چکی تھیں تو یہ کانٹ ہی تھا جس نے ان دو مختلف فلسفیانہ روایات کی تنقید پیش کی اور اپنے فلسفے کو تنقیدی فلسفے کا نام دیا۔ کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" کا شمار فلسفے کی تاریخ کی چند گنتی کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب 1781 میں پہلی بار شائع ہوئی اس کتاب میں پیش کیے گئے خیالات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس عظیم فلسفی کے اندر مستقبل میں جھانکنے کی قوت کس قدر زیادہ تھی۔ کانٹ نے 1781ء میں گویا خدا کو تخت سے اتار اور انسان کو اس کی جگہ لا کر کھڑا کر دیا۔ بادشاہت جو یورپ میں خدا کا نعم البدل سمجھی جاتی تھی اسے ٹھیک آٹھ برس بعد فرانسیسی انقلابیوں نے 1781ء میں تہس نہس کر دیا۔

یورپ میں جاگیرداری اور مسیحی الٰہیات کے انہدام کے تمام تصورات "تنقید عقل محض" میں موجود ہیں۔ کانٹ کے فلسفے کا ماحصل یہ ہے کہ خدا طے نہیں کرتا کہ انسان کو کیسا ہونا چاہیے بلکہ انسان تعقلی، منطقی اور جدلیاتی تجربہ سے خود طے کرتا ہے کہ خدا کی ماہیت کیا ہے؟ انسان کو مرکز میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کو لامرکز کر دیا جائے۔ دونوں کا مرکز میں رہنا ناممکن ہے۔ انسان خدا کو منہدم نہیں کرتا بلکہ خدا کو اپنے معاملات میں دخل دینے اور اپنے لیے علمی، اخلاقی، اور سماجی اقدار کا تعین کرنے سے روکتا ہے۔ "تنقید عقل محض" میں تعقلی، منطقی اور جدلیاتی انکوائری کے بعد آزادی کا تصور ایک لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آ سکتا ہے۔ آزادی کانٹ کے نزدیک ایک یونیورسل تصور ہے۔ جس کے بغیر اخلاقیات کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کے آفاقی تصور کے حوالے سے یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ کانٹ ہی تھا جو تعقل کی بالادستی کا فلسفیانہ جواز ہی نہیں انسان کی مرکزیت کا تعقلی، منطقی جواز بھی فراہم کرتا ہے۔

کانٹ ریاستی نظام میں مذہب کے کردار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی بات کرتا ہے۔ آزادی، مساوات، نظریہ علم، نظریہ ارتقاء، جمہوریت، ملکوں کی فیڈریشن، نظریہ کائنات اور نظریہ ریاست وغیرہ یہ سارے نظریات کانٹ کی فکر میں ملتے ہیں۔ نپولین نے ایک بار حکم دیا کہ اس کے سامنے کانٹ کے فلسفے کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ خلاصہ سننے کے بعد اس نے کانٹ کو "شاطر" کہہ کر اس کا نام اپنے پسندیدہ لوگوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں کانٹ کے فلسفے میں انقلابیت کے عناصر نمایاں طور پر موجود تھے۔ عہد حاضر کے یورپ کو آج بھی کانٹ کی فکر میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ کی فکر نے مغربی فکر و تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مغربی تہذیب پر کانٹ کے اثرات کی وجہ سے اسلامی فکر و تہذیب بھی متاثر نظر آتی ہے۔

کانٹ کو موجودہ دور کے عینی فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے نزدیک یہ شرف دوسرے جرمن عینی فلسفی ہیگل کو حاصل ہے۔ کانٹ کے فلسفے میں ہمیں کوئی زیادہ جدت نظر نہیں آتی۔ اس کی سیاسی فکر پر روسو اور مان تسکیو کے افکار کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مملکت کی ابتداء اور ماہیت کے بارے میں وہ روسو اور حکومت کی تشریح میں مان تس کیو کی پیروی کرتا ہے۔ دوسرے جرمن مفکروں کی طرح کانٹ کا خیال ہے کہ مملکت ایک اخلاقی شخصیت کا نام ہے جو اس کے ارکان کے روحانی مفاد کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ جس میں افراد

کی سمجھ یا مرضی کو دل ہوتا ہے۔اس کا خاص مقصد ثقافتی اور تعلیمی ہوتا ہے اور جب وہ خالص مادی نوعیت کے کام کرتی ہے مثلاً مقدموں کا تصفیہ، مفلسوں کی امداد کے لیے قانون سازی یا غیر ملکی سامان پر حصول نافذ کرتی ہے تب بھی اس کا خاص مقصد اخلاقی ہوتا ہے۔اس کا خاص مقصد یہ سب کچھ کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ افراد کی اجتماعی بھلائی کا کام کرے اور وہ مثالی قوم بن جائیں۔

جرمن مثالیت پسندی

جرمن فلسفہ نے انیسویں صدی کے دوران غلبہ پایا اور یہ عمانوئیل کانٹ کی بدولت ممکن ہوا اس کے مثالیت پسند (آئیڈیل ازم) فلسفہ نے فلسفیانہ سوچ کا دھارا یکسر تبدیل کر دیا۔اس کے فلسفہ کا دعٰوی تھا کہ ہم کبھی بھی ایسی چیزوں کے بارے میں کوئی چیز نہیں جان سکتے جو ہماری ذات سے ہٹ کر پائی جاتی ہیں۔اگرچہ وہ ہیوم اور روسو سے محض چند برس چھوٹا تھا۔لیکن کانٹ کا تعلق بہر حال اگلی نسل سے تھا اس نے اپنا کام ان کی وفات کے بعد کیا۔کانٹ کے پیروکاروں میں فشٹے، شیلنگ اور ہیگل شامل تھے۔یہ سب مل کر جرمن ''مثالیت پسند'' کے طور پر جانے گئے۔لیکن شوپن ہار کو بھی اسی صف میں شامل کیا گیا۔اس کی کانٹ کے فلسفہ کی مخصوص تعبیر میں مشرقی فلسفہ کے خیالات مدغم تھے۔ہیگل سخت گیر ''مثالیت پسند'' تھا۔اس کے پیروکار کارل مارکس نے خوب صورتی کے ساتھ جرمن فلسفیانہ طریقوں، فرانسیسی انقلابی سیاسی فلسفہ اور برطانوی معاشی نظریہ کو اکٹھا کر دیا۔

فکر مغرب پر کانٹ کی فکر کے اثرات دو تحریکوں کے حوالے سے ہیں۔جن میں تحریک رومانویت اور تحریک تنویر ہیں ہیں ان دونوں تحریکوں نے پر ہی تہذیب مغرب میں ت وہ تصور (Right) اور تصور خیر (Good) سرمایہ داری اور جمہوریت قائم ہیں۔18 ویں صدی میں جس فکر نے عیسائیت کو شکست دی اس کی دو شاخیں تھیں:

1. تحریک تنویر (Enlightenment)
2. تحریک رومانویت (Romanticism)

یہ دونوں تحریکیں مغربی تہذیب کی روح رواں تھیں مغربی تہذیب کے بنیادی آدرش انہیں تحریکوں سے حاصل ہوتے ہیں اور مغربی تہذیب کے بنیادی تصورات، عقائد، افکار نظریات فی الحقیقت تحریک تنویر اور تحریک رومانویت ہی سے نکلے ہیں۔

کانٹ اور مثالیت پسندی کے اردو ادب پر اثرات

علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں کہ مسلم تعلیمی اداروں میں مثالیت پسندی اور رومانیت کی تحریک کانٹ اور مغربی فکر و فلسفے کی مرہون منت ہے۔

کانٹ جرمنوں کی فلسفیانہ رومانیت کا باپ ہے اور جرمن، رومانیت پسند روسو [1] کے روحانی بچے ہیں۔فلسفے میں رومانیت کانٹ کی ذات کے ساتھ داخل ہوئی اور ادب و شعر میں لسنگ [2] اور ہرڈر [3] سے ہوتی ہوئی گوئٹے [1] اور شلر [2] پر منتٰی ہوئی۔کانٹ مثالیت

---

[1] روسو(۱۷۱۲ تا ۱۷۷۸) فرانس کا مشہور روشن خیال جمہوریت مذہب فطرت کا فلسفی

[2] جرمن فلسفی، ڈرامہ نگار، نقاد، روشن خیال اور جرمن ادب پر اثر رکھنے والا

[3] ہرڈر (25 اگست 1744 - 18 دسمبر 1803) ایک جرمن فلسفی، عالم دین، شاعر اور ادبی نقاد تھا. وہ روشن خیالی، اسٹورم اینڈ ڈرینگ، اور ویمار کلاسیکی

پسند ہے۔جدید فلسفیانہ تحریکوں میں ہر کہیں کانٹ کے اثرات کا کھوج ملتا ہے۔[3]

فلسفے میں کانٹ کے واسطے سے رومانیت شوپن ہار[4] اور نطشے[5] کی ارادیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

فلسفے میں ایک باقاعدہ سکول آف تھاٹ ہے اور اُسکا نام ''مثالیت پسندی '' یاآئیڈیل ازم ہے اور یہ مادیت پسندی یا مٹیریل ازم کی عین ضد ہے۔اس کے برعکس مادیت پسند مادے کو ہی سچائی قرار دیتے ہیں۔اور مادے کو ذہن پر ترجیح دیتے ہیں۔مثالیت پسندی کی ابتداء تو شاید قبل از سقراط قدیم یونانی فلسفیوں فیثا غورث[6] اور پار میاٹیڈیس [7] نے کی تھی۔لیکن اس کا پہلا جاندار مبلغ افلاطون[8] تھا۔اور جرمن فلاسفر عمانویل کانٹ نے اس کو بام عروج پر پہنچادیا۔کانٹ کی فکر کے مسلم تعلیمی اداروں پر اثرات کے حوالے سے ہمارے پاس غالب کی شاعری بھی موجود ہے۔ہم اس بات کا اندازہ تو نہیں کر سکتے کہ غالب نے کانٹ سے کتنااثر لیا،لیکن یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اٹھارویں صدی فلسفہ اور فکر کے حوالے سے یورپ اور مسلم معاشرے میں بہت اہم ہے تب یورپ اور مسلم دنیا کے حالات فکر وفلسفہ کے حوالے سے ایک جیسے تھے۔جدید فلسفیانہ تحریکیں چاہے وہ ادبی ہوں یا معاشرتی یافلسفیانہ وہ کائٹ کی مرہونِ منت ہیں۔

کانٹ کہتا ہے کہ زمان و مکان ہمارے ذہن کی تخلیقات ہیں ۔[9]

غالب کی شاعری میں اس کائنات کے بارے میں ایک خاص زاویہ پیش نظر ہے کہ یہ سب کچھ جو ہمیں نظر آرہا ہے۔اس کا وجود خارجی نہیں، یہ انسانی ذہن ہی کی تخلیق ہے۔یہ ایک طلسم ہے جو انسانی وہم نے باندھ رکھا ہے۔غالب کو تصوف سے خاص شغف تھا،اور وہ وحدت الوجودی تھے۔

دراصل وحدت الوجود اور مثالیت پسندی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ مثالیت پسندی

ازم کے ادوار سے وابستہ ہے۔

(1) آلمان یعنی جرمنی کا مشہور شاعر اور فلسفی تھا۔وہ 28 اگست 1749ء کو پیدا ہوا اور (Johann Wolfgang von Goethe) گوئٹے(آلمانی زبان میں 22 مارچ 1832ء کو انتقال کیا۔شاعری،ڈراما،ادب،فلسفہ،الٰہیات،عرض بے شمار اصناف میں لکھتارہا۔

(2) شلر(نومبر 10،1759، 9 مئی،1805) معروف جرمن ڈرامہ نگار،شاعر،اور ادیب

(3) علی عباس جلال پوری ،روایات فلسفہ،تخلیقات،لاہور،ص:۶۷

(4) شوپن ہار/آرتھر(1788 تا1860)جرمن عینیت پرست فلسفی طریق اختیار نامعقولیت اور قنوطیت کا پرچارک

(5) فریڈرک نطشے یا نیتشے (Friedrich Nietzsche) (1844-1900) انیسویں صدی کا جرمن فلسفی تھا،اس کے خیال میں طاقت ہی انسانی معاملات میں فیصلہ کن عنصر ہے،اس نے فوق البشر (Superman) کے تصور کو آگے بڑھایا

(6) فیثاغورث(571تا497ق م)قدیم یونانی ریاضی دان عینیت پرستی فلسفی

(7) پار میاٹیڈیس سقراط کا شاگرد تھا

(8) افلاطون(347تا427) یونانی فلسفہ ادب عملیات قانون سیاست قدیم یونان کا فلسفی اور سائنس کی ایک آدمی کا بانی تھا یہ عقاءد میں مغربی دنیا کا اولین اعلی تعلیم کا ادارہ تھا تھا وہ فلسفہ کی ترقی میں خاص طور پر مغربی روایت میں سب سے زیادہ اہم شخص تصور کیا جاتا ہے۔

(9) علی عباس جلال پوری،روایات فلسفہ،تخلیقات،لاہور،ص:۶۷

وحدت الوجود کا حصہ ہے۔ ویسے وحدت الوجود کا فلسفہ مسلمانوں میں شام کے نسطوری عیسائیوں کے ذریعے آیا تھا۔ جنہوں نے اسے اسکندریہ کے صوفی مثالیت پسند فلسفی فلاطینوس[1] سے حاصل کیا تھا۔ یہی وہ فلاطینوس ہے جس کی تحریروں کو ایک زمانے تک مسلم مفکر ارسطو[2] کی تحریریں سمجھتے رہے۔ غالب چونکہ ''وجودی'' تھے لامحالہ مثالیت پسندی انکے کلام میں آگئی۔ ہم غالب کے فارسی کلام سے کچھ شعر پیش کریں گے جو اس بات کی وضاحت کریں گے کہ غالب وحدت الوجودی اور مثالیت پسند تھے۔

دود سودائے تتق بست آسمان نامید مش

دیدہ بر خواب پریشان زد، جہاں نامید مش

خیالِ خام کا ایک دھواں سا ہمارے سر پر چھا گیا، میں نے اس کا نام آسمان رکھ دیا۔ آنکھوں نے ایک پریشان خواب دیکھا اور میں نے اسے جہان کہہ دیا۔

وہم خاکے ریخت در چشمم بیاباں دید مش

قطرہ بگداخت، بحرِ بیکراں نامید مش

وہم نے میری آنکھوں میں خاک ڈال دی اور وہ مجھے بیاباں بن کر نظر آئی۔ ایک قطرہ تھا جو پگھل کر رہ گیا میں نے اسے بحرِ بیکراں کا نام دیا۔

باد دامن زد بر آتش نو بہاراں خواند مش

داغ گشت آں شعلہ، از مستی خزاں نامید مش

ہوا نے آگ کو بھڑکایا میں نے اسے بہار کہہ دیا۔ اسی آگ کے شعلے جل کر جب داغ بن کر رہ گئے تو میں نے اسے خزاں کا نام دیا۔

قطرہء خونے گرہ گردید، دل دانستمش

موجِ زہرابے بہ طوفاں زد زباں نامید مش

ایک قطرہء خوں تھا بل کھا کر گرہ بن گیا اور میں نے اسے دل سمجھ لیا۔ ایک زہراب کی لہر تھی اس میں تلاطم برپا ہوا میں نے اسے زباں کہہ دیا۔

غربتم ناساز گار آمد، وطن فہمید مش

کرد تنگی حلقہء دام آشیاں نامید مش

پردیس مجھے راس نہ آیا، ناچار میں نے اسے وطن سمجھ لیا۔ حلقہء دام تنگ نکلا میں نے اسے آشیاں کہہ دیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل می گفتمش

رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامید مش

---

[1]) یونانی فلسفی جس نے حسن ازل کی کشش کو عشق کا نام دیا ہے (

[2]) ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا سقراط کا شاگرد اور سکندر اعظم کا استاد تھا (

وہ ہمارے پہلو میں اس شان سے بیٹھا تھا کہ میں نے اسے دل کہا، وہ اس انداز سے اٹھ کر گیا کہ اسے جاں کہنا پڑا۔

ہر چہ از جاں کاست در مستی بہ سود افزودمش

ہر چہ با من ماند از ہستی زیاں نامیدمش

مستی کے عالم میں جو کچھ زندگی میں کمی واقع ہوئی میں نے اسے نفع میں شمار کیا اور میری ہستی میں سے جو کچھ بچ رہا اسے نقصان سمجھ لیا۔ یعنی زندگی کے وہی لمحات تھے جو عالمِ مستی اور ذوق وشوق میں گزر گئے، بقیہ زندگی تو گویا زندگی ہی نہ تھی۔

تا ز من بگسست عمرے، خوش دلش پنداشتم

چو بہ من پیوست لختے، بدگماں نامیدمش

جب تک وہ مجھ سے ایک طویل عرصے کیلیے الگ ہو کر رہا میں اسے ایک خوش ذوق انسان سمجھتا رہا۔ جب وہ تھوڑی مدت کیلیے مجھ سے آملا تو میں نے اسے بدگماں کا لقب دیا۔

اُو بہ فکر کشتنِ من بود، آہ از من کہ من

لا ابالی خواندمش، نامہرباں نامیدمش [1]

وہ میرے مارنے کی فکر میں تھا۔ کتنی افسوس کی بات ہے کہ میں اسے لا ابالی کہتا رہا اور نامہرباں کے نام سے پکارتا رہا۔

(اس میں باقی دو تین اشعار بھی ذکر کرنے ہیں)

غالب ہمارے مسلم مفکرین اور شاعروں میں وہ ہیں جن کا اُردو ادب پر ایک خاص اثر ہے۔ ان کے اس اثر نے ہمارے تعلیمی اداروں پر اور ہمارے ادیبوں اور ادب کے اساتذہ پر اپنی شاعری اور فکر سے اثر ڈالا ہے۔ کانٹ نے اپنے زمانے کے ہر مفکر کی طرح عظمت حسن پر ایک مقالہ لکھا۔ رات عظیم ہے، دن حسین ہے، سمندر عظیم ہے، زمین خوبصورت ہے، مرد عظیم ہے اور عورت حسین ہے علی ہذا القیاس۔۔۔ [2] تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کا ذکر کر چکے ہیں یہ دونوں تحاریک کانٹ کے فلسفے کی مرہون منت ہیں۔ ادب میں مثالیت پسندی کے علاوہ رومانوی ادب پر بھی کانٹ کے اثرات نمایاں ہیں۔ مغربی فکر و تہذیب اور فلسفہ نے ہمارے اُردو رومانوی ادب پر اور اس کے علاوہ انگریزی ادب جو ہمارے تعلیمی اداروں میں پڑھایا جاتا ہے اُس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے اثرات ہمارے معاشرتی اداروں پر بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ہمارے سماجی رویوں پر اثرانداز ہوئے۔ صرف اس بات کی وضاحت مطلوب ہے کہ کیا کانٹ کا تعلق رومانوی ادب / یا رومانویت سے رہا ہے۔ اردو ادب کے نقادوں نے رومانوی ادب کا ذکر مغربی فکر و فلسفہ اور مغربی فلاسفر کے حوالے سے کیا ہے جس میں کانٹ کا ذکر بھی موجود ہے۔

([1]) غالب، اسداللہ، دیوان غالب دہلوی، تحقیق: ڈاکٹر محمد حسن حائری، احیاء کتاب، تہران، ۱۳۷۷، ص: ۲۵۹

([2])(Bertrand, Russell, A History of Westren Philosophy, & Unwin LTD,London, 1961,p:806

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

اردو ادب میں رومانوی تحریک ابتداء اور آغاز

انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان میں ایک ایسے انقلاب کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی جو ہندوستان کے ساکن تمدن اور اس کی منجمد ذہنی و دانشورانہ فضا کو ہمیشہ کے لیے شکست وریخت سے دوچار کرنے والا تھا۔ یہ انقلاب ہمہ گیر تھا۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان دینی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے قرون وسطی سے عہد جدید میں داخل ہو رہا تھا۔ اردو ادب میں یہ انقلاب رومانوی تحریک کی صورت میں شروع ہوا۔ رومانوی تحریک سر سید اور حالی کی اصلاحی تحریک کے بعد اردو ادب کی بڑی اہم کروٹ تھی۔ علاوہ بریں رومانوی ادبیات کی تاسیس میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، سجاد انصاری اور دوسرے فن کاروں کے واسطہ سے علی گڑھ کا بڑا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ابتدا میں جن تصورات نے اس تحریک کے پس منظر میں پرکھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے اُن تصورات نے اس تحریک کے انشاپردازوں کو متاثر کیا ہے۔ اُن کی فکری بنیادیں واضح ہیں، جس کے بطن سے آگے چل کر بے شمار ادبی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ہمارے ہاں یہ تحریک شعوری کوشش اور تنظیم کے ساتھ شروع نہیں ہوئی۔ البتہ اگر تحریک سے وسیع تر اشتراک اقرار، روحانی ہم آہنگی اور فکری وحدت مراد لی جائے تو رومانویت کو اردو ادب کی بڑی تحریکات میں شمار کیا جائے گا۔ (1)

عبدالرحمن بجنوری کی اہم تصنیف جس کا نام محاسن کلام غالب ہے، کے مقدمہ میں اس تاریخی جملے سے اپنی تحریر کا آغاز کیا ہے۔

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید اور دوسری دیوان غالب۔'' (2)

اس ایک جملے میں رومانوی تفریط پسندی، جذباتیت اور چونکا دینے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ ان کی فکر پر رومانوی اثرات اور بھی کئی طریقوں سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ کہ محاسن کلام غالب میں بار بار جن شاعروں اور فلسفوں کا تذکرہ آتا ہے وہ سب کے سب یورپ کی رومانوی تحریک سے متعلق رہے ہیں، ان میں شیگل، ہائنے، شیلر، کانٹ، برگسان اور نطشے کے نام بار بار ملیں گے اور یہ تمام فلسفی اور ادیب وہ ہیں جنھوں نے عقل سے زیادہ جذبات اور وجدان کو حقیقت کے ادراک کے لیے کارآمد بتایا ہے۔

تہذیب مغرب میں رومانوی تحریک کا پس منظر

تحریکات کا وجودیاتی مظہر فکریات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ فکریات مختلف نظریہ سازوں کے فکری نظام سے عبارت ہے۔ مختلف تحریکات کی وجودیاتی تشکیل میں نظریہ سازوں، مفکروں اور دانشوروں کے فکری اور ذہنی رویے اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ رومانوی تحریک کا ادبی کلامیہ بھی وارٹن، ہرڈلر، مادام ڈی اسٹیل، شیلنگ، شلیگل، روسو، وڈز ورتھ، سانت بیو اور کولرج کے نظریات فکریات پر مشتمل ہے، رومانوی تحریک کے عالمی منظر نامے پر ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو کی رومانوی تحریک کی ساختیاتی اور وجودیاتی تشکیل میں بھی ان دانشوروں، مفکروں اور نظریہ سازوں کا فکری نظام کار فرما ہے۔ روسو کا نظریBack to Nature بھی اس پر اثر انداز ہوا اور شیلنگ، شلیگل اور مادام ڈی سماجی اخلاقیات، ثقافتی قدریں اور جغرافیائی نظام مغرب سے یکسر منفرد ہیں۔ دیومالائیں کسی بھی سماج کا

---

(1) محمد حسن، ڈاکٹر، اُردو ادب میں رومانوی تحریک، شعبہ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۵، ص:۵

(2) بجنوری، عبدالرحمٰن، محاسن کلام غالب، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن، ، ص:

تہذیبی لاشعور ہوتی ہیں۔ہند کے ثقافتی اور تہذیبی ترجیحات میں یہاں کی دیومالائیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔رام اور سیتا کی دیومالائی کہانی ہند کے مخصوص مزاج کی عکاس ہے۔مغربی دیومالاؤں میں کہیں بھی ایسی کہانی مذکور نہیں ہے۔اس حوالے سے بھی ہند اور مغرب کے تہذیبی اور ثقافتی ساخت کے تفاوت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

رومانوی تحریک کی تفہیم کے لیے اس کے پس منظر میں موجود علی گڑھ تحریک کے نظریات واسالیب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔علی گڑھ تحریک کے فکریات و نظریات نے ہند کے تہذیبی، ثقافتی، سماجی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی قدروں کے تغیر و تبدل میں کلیدی رول انجام دیا۔ہمیں یہاں محض ادبی قدروں کی تبدیلی سے غرض ہے لہذا ہماری گفتگو اسی نہج پر ہوگی۔

اعلیٰ ادب حقیقت و تخیل کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔علی گڑھ تحریک کے زیر اثر تخلیق پانے والے ادب میں تخیل اور جذبے کا پر تو نسبتاً کم ہے۔دراصل، علی گڑھ تحریک کا فکری نظام معروضی حقیقت نگاری، عقلیت پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی مقصدیت پر مرکوز تھا۔اس تحریک کا مزاج سائنٹفک تھا۔علی گڑھ تحریک کے اس سائنٹیفک مزاج کے رد عمل کے طور پر رومانوی تحریک معرض وجود میں آئی۔رومانویت علی گڑھ تحریک کے اساسی نظریات و تفکریات سے یکسر منحرف تھی۔عقلیت، معروضیت، مقصدیت اور حقیقت پسندی کے متعلق سر سید اور حالی کے منشور کو اس نے ہر سطح پر چیلنج کیا۔رومانویت نے ادب پاروں میں انسانی عقلیت کے بجائے اس کے محسوسات وجذبات، معروضی حقیقت نگاری کے بجائے تخیلاتی حقیقت نگاری اور مقصدیت کے بجائے جمالیاتی کوائف پر اپنی توجہ مرکوز کی۔رومانویت نے Art for Art's Sake کو اپنا بنیادی منشور قرار دیا۔جو ادب برائے زندگی کے نظریے کو رد کرتا ہے۔رومانوی تحریک کی ساختیاتی تشکیل میں الفاظ کے جدلیاتی نظام کی کلیدی اہمیت ہے جو علی گڑھ تحریک کے پروردہ سلیس اسلوب کی مکمل طور نفی کرتا ہے۔

رومانوی تحریک

رومانویت کی تعریف متعین کرنے سے قبل اسی قبیل کے دو لفظ رومان اور رومانس کی حقیقت وماہیت کی تفہیم از حد ضروری ہے۔اس سے رومانویت کی کلی تفہیم کی راہ آسان ہوگی۔"رومان" میں نسوانی حسن کی دلفریبیوں، فطرت کی منظوم فرضی قصوں پر ہوتا ہے جو کسی ہیرو کی مہمات سے متعلق ہوتے ہیں۔ان قصوں کی پوری فضا مافوق الفطرت ہوتی ہے۔اور ان میں واقعات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔رومان اور رومانس، رومانوی فکر کا ہی جزو ہیں۔اور ان کا رومانویت کی وجودیاتی تشکیل میں اہم حصہ ہے۔رومانویت کی تعریف کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

"روایات سے بغاوت نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، وفور تخیل اور وفور جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادی، خیال، حسن سے تابمقدر لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس وکرب"۔رومانویت عقلیت کے بجائے جذبات کے وفور پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔یہ فطرت میں پوشیدہ ازلی وابدی خوبصورتی کو آشکار کرتی ہے نیز اپنے اندر آزادیٔ فرد یعنی تمام تر بندشوں کو توڑ دینے کا مفہوم بھی رکھتی ہے۔ماضی سے قربت اور فرد کا روایات کے خلاف علم بغاوت بھی اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔تخیل کی مکمل آزادی کے ساتھ ساتھ یہ انسانی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔رومانویت میں

یاسیت و قنوطیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔انسان کے وجود اور تنہائی کا ازلی وابدی بار اور اس کا احساس، رومانویت کے فکری سر چشمے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔تاہم واضح رہے کہ رومانویت سے متعلق تمام تر شعر وادب مذکورہ فکری بنیادوں کے اعتبار سے یکساں نہیں ہے۔ تفہیم کے لیے رومانویت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔انفعالی رومانویت اور عملی رومانویت۔انفعالی رومانویت کو منفی رویے پر حامل رومانویت کہہ سکتے ہیں۔یہ زندگی اور اس کے منفی پہلو سے لڑنے کے بجائے فرار کو اہمیت دیتی ہے نیز زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کے بجائے آنکھیں چراتی ہے۔اس کے برعکس عملی رومانویت خرد کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے زندگی اور اس کے تلخ تجربات سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کرتی ہے۔

اردو میں رومانوی تحریک کے خدوخال کو مستحکم کرنے میں محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، میر ناصر علی، عبدالعلیم شرر اور سر عبدالقادر کو اہمیت حاصل ہے۔ان تمام حضرات نے علی گڑھ کے تعلقی حصار کو رومانویت سے توڑنے کی سعی کی۔آزاد اور شبلی علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کے اسلوب نگارش سے ان کے رومانوی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے شعوری طور پر علی گڑھ تحریک کے نظریے کو عام کیا۔ مگر فطرتاً ان پر رومانویت کا گہرا اثر تھا۔میر ناصر علی کے رسائل ''تیرہویں صدی' ''صدائے عام''اور ''فسانہء ایام'' نے رومانویت شامل ہیں۔

اردو شاعری میں رومانویت

شاعری اور رومانویت کا رشتہ بہت گہرا رشتہ ہے'' شاعری عقل ودانش کا اظہار نہیں ہے، کیونکہ اس کا پہلا اور آخری کام احساس کی ترجمانی اور جذبات کا براہ راست انکشاف ہے''۔میراجی کا یہ قول شاعری میں رومانوی عناصر کی اہمیت کو آشکار کرتا ہے۔ورڈزورتھ کا یہ کہنا ہے کہ ''شدید جذبات کا بے ساختہ اظہار شاعری ہے'' یا شبلی کا یہ کہنا کہ ''انسان کے شدید مغموم جذبات ہی اعلی شاعری کے محرک ہوتے ہیں ''ان اقوال کے پس منظر میں بھی رومانوی فکر کے عمل دخل کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔انسانی محسوسات وجذبات جن کی نوعیت خواہ غم کی ہو یا مسرت کی، رومانویت کے فکریاتی نظام سے متعلق ہوتے ہیں۔ہر شاعر اپنے اپنے طور پر ان محسوسات کو اپنے مخصوص اسلوب یا پیرایہ اظہار میں پیش کرتا ہے۔

علامہ اقبال اور رومانویت

اقبال کی شاعری میں رومانوی عناصر کی نشاندہی اکثر ناقدین نے کی ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے نزدیک اقبال کے ہاں جذبات اور'' وجدان کی افراط اور غلبہ، ان کی خطر پسندی اور بے باک اور طوفانی جذبوں سے محبت کرنے کا رجحان وہی آرزو مندی جسے رومانویت کا بنیادی عنصر کہا گیا ہے ان کا رومانوی فکر، ان کا فلسفہ خودی اور مرد مومن کا تصور، فرد کی تکمیل کا جذبہ، شوکت پاستان کا تصور ان کی تلمیحیں ، فطرت اور اس کے مظاہر سے لاتعداد خوبصورت تشبیہیں اور استعارے، ان کے ادبی انداز بیان کی آراستگی اور فطرت اور قدرت سے ان کا متاثر ہونا رومانوی اثر کا واضح ثبوت ہے۔[1]

[1]) محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، مکتبہ کاروان، ملتان، ۱۹۸۶، ص: ۲۹ (

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

لیکن اس سب کے باوجود وہ اقبال کو رومانوی کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔[1]

ان کے بر خلاف ڈاکٹر انور سدید واضح طور پر کہتے ہیں کہ اقبال ''مغرب کے رومانوی شعرا سے متعارف ہوئے۔..... تو رومانویت نے ان کے قلب و زبان پر قبضہ جما لیا''[2]

ان کے نزدیک اقبال کی رومانویت کا اظہار اقبال کی حسن ازل کی طلب و جستجو، ان کا ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرنا ان کی رومانوی کرداروں کی تخلیق جن میں مرد مومن اور منفی سطح پر ابلیس شامل ہیں ان کے مغربی شعرا کے تراجم، اور اقبال کا فرد کے یقین کو سنبھالا دینا ان سب عناصر سے ہوا۔[3]

یقیناً یہ سارے اثرات اقبال کی رومانویت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ تمام خصوصیات ظاہری خصوصیات ہیں۔ اقبال کی رومانویت کا اصل دھارا یقیناً زیادہ گہرا اور عمیق ہے اور یہ سب خصوصیات اس کا محض خارجی مظہر ہیں۔ رومانویت کی وہ '' اصل'' جس کا یہ سب محض خارجی عکس ہیں اقبال کی گہری رومانویت کی نشاندہی کرتا ہے۔ آیئے اس کا جائزہ لیں۔ اقبال کے ہاں رومانویت کا اولین اظہار مظاہر فطرت سے ان کی دلچسپی سے ہوتا ہے۔ مخزن کے سب سے پہلے شمارے اپریل ۱۹۰۱ ءمیں اقبال کی نظم 'ہمالہ' شائع ہوئی اور بقول سر عبد القادر یہاں سے ان کی ''اردو شاعری '' کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔"

ابتدائی دور میں اقبال نے اکثر مغربی رومانوی شعرا کی نظموں کے ترجمے بھی کیے مغربی رومانوی فلسفیوں اور ادیبوں سے متاثر بھی ہوئے وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔'' ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری راہنمائی کی۔..... بیدل اور غالب نے مجھے سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈزورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دھریت سے بچا لیا۔''[4]

اقبال کی رومانویت میں فطرت پسندی کا انداز ورڈزورتھ سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے کم از کم پہلے دور کی شاعری میں لیکن اس کے بعد وہ فطرت کی اشاریت سے اس کی ایمایت کی طرف سفر کرتے ہیں اور گوئٹے کا علامتی انداز غالب آ جاتا ہے۔ اس دور میں وہ فطرت کو زندہ تو تصور کرتے ہیں اور بامعنی بھی جس سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس دور میں " ہمہ اوست" کے نظریہ سے متفق ہیں ۔[5]

لیکن فطرت کو حقیقت کی تخلیقی فعالیت [6] کا حصہ سمجھنے کے لیے ابھی انہیں کچھ وقت درکار تھا۔

اقبال کی رومانویت کا دوسرا اظہار نے دل اور غالب کے حوالے سے ہوتا ہے اور وہ ہے اظہار و بیان میں ایمائی اور علامتی انداز ۔۔۔اقبال کی شاعری علامات اور ایمائیت کی شاعری ہے۔ اقبال خود فن کو رمز و ایما کا انداز سمجھتے تھے وہ کہتے ہیں۔ '' میں شاعری میں

---

[1]) ایضاً، ص:۳۴(

[2]) ایضاً، ص:۴۴(

[3]) ایضاً، ص:۴۷(

[4]) جاوید اقبال، ڈاکٹر، شذرات فکر اقبال، مترجم: افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص:۱۰۵(

[5]) صدیقی، افتخار احمد عروج اقبال، بزم اقبال، لاہور، ص:۱۴۸(

[6]) محمد اقبال، ڈاکٹر، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص:۱۸(

ایک حد تک اخفااور ابہام کا عنصر پسند کرتاہوں کیونکہ مبہم اور مخفی پیرا یہ جذ باتی اعتبار سے عمیق اور غائر معلوم ہوتا ہے۔"[1]

اقبال کی شاعری ایمائیت اور علامتی شاعری کا ایک منفرد نمونہ ہے۔اقبال کی ایمائیت وہ تجریدی ایمائیت نہیں جو اردو شاعری میں اقبال کی اہمیت و حیثیت سے کسی کو کلام نہیں۔اقبال کی شاعری میں رومانوی عناصر کو فکر و فن کی سے پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گرچہ اقبال ایک مخصوص فکری نظام کے تابع تھے اور ان کی شاعری اسی فکری نظام کی ترجمان ہے، نیز اقبال کا شعری سرمایہ بھی ان کے فلسفیانہ ذہن اور پتہ فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے تاہم ان کی نظموں کی ساخت میں رومانوی عناصر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال مغرب کے شاعر فطرت ورڈزورتھ سے متاثر تھے۔اسی سبب وہ نیچر کی گود میں ذہنی آسودگی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ فطرت سے قربت فطرت کی عکاسی، ماضی کی یادیں، عشق و خرد کی کشمکش ان کی شاعری کی اساسی خصوصیات ہیں ان کے رومانوی زبان کو آشکار کرتی ہیں۔اس کے علاوہ فلسفہ خودی اور مرد مومن کا تصور بھی رومانویت کے زیر اثر ہے۔یہ چند اشعار اس ضمن میں بہ طور دلیل پیش کیے جاسکتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کدہ و دمن

پھر مجھے نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن[2]

حقیقتِ حسن وغیرہ کو اقبال کی رومانوی نظمیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

اختر شیرانی اور رومانویت

اختر شیرانی کی پوری شاعری رومانویت سے مملو ہے۔اختر شیرانی کو شاعر رومان کے لقب سے نوازا گیا ہے۔اقبال کے یہاں جو رومانوی انداز ملتا ہے اختر کی شاعری اس سے جداگانہ اور منفرد ہے۔اقبال نے جہاں مرد مومن کا تصور پیش کیا وہیں اختر نے سلمیٰ اور

[1]) جاوید اقبال، ڈاکٹر، شذرات فکر اقبال، ص:۱۰۵ (

[2]) محمد اقبال، علامہ، بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷، ص:۳۱۰ (

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

ریحانہ سے اردو والوں کو متعارف کرایا۔اختر سے قبل اردو کی شاعری یعنی غزلیہ روایت میں محبوب و معشوق مذکر ہوا کرتا تھا۔اختر شیرانی پہلا شاعر ہے جس نے انسانی جسم میں دکھنے والی عورت کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔اختر کا عشق حقیقی نہیں تخیلاتی تھا اور وہ ایک IDEAL معشوق کو اپنے ذہن میں۔بسائے ہوئے تھے اور اس کی شاعری کا بیش تر حصہ اس خیالی محبوب سے مکالمے اور چھیڑ چھاڑ پر محیط ہے۔ان کے چند شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات
کتنی سرسبز ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات[1]

داستان دل بے تاب سنائیں گے انھیں
آپ روئیں گے گلے مل کے رلائیں گے انھیں
خود ہی پھر رونے پر ہنس دیں گے ہنسائیں گے انھیں
اور جرات کی تو سینے سے لگائیں گے انھیں[2]

دوسری جگہ کہتے ہیں:

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھادے فرش گل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دے مستیاں پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آوں
کہ سلمیٰ، میری نور برسائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں[3]

اختر شیرانی نے قدرتی مناظر پر بھی نظمیں لکھی ہیں مگر اس کے بین السطور میں بھی سلمیٰ یا ریحانہ کے خیالی پیکر کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔اے عشق کہیں لے چل، جہاں ریحانہ رہتی ہے، آج کی رات، ایک شاعرہ کی شادی پر اور مرد و عورت کی یک رنگی وغیرہ نظموں میں اختر شیرانی کے رومانوی انداز کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جوش کو شاعر فطرت کہا جا سکتا ہے۔بقول عبادت بریلوی وہ بیک وقت شاعر شباب بھی ہیں اور شاعر انقلاب بھی۔جوش کی شاعری میں دل و دماغ کی کشمکش بہت واضح ہے۔جوان کے رومانوی مزاج پر دلالت کرتی ہے۔

---

[1]) اختر شیرانی، کلیات اختر شیرانی، مرتب: گوپال متل، نیشنل اکاڈمی، دہلی، ۱۹۶۹، ص:۱۷۷ (

[2]) اختر شیرانی، کلیات اختر شیرانی، ص:۱۷۷ (

[3]) اختر شیرانی، کلیات اختر شیرانی، ص:۷۲ (

جوش ملیح آبادی اور رومانویت

جوش کی شاعری میں وفور جذبات کا غلبہ ہے۔ ترقی پسند تحریک سے نظریاتی وابستگی کے باوجود جوش کا فطری میلان رومانیت کی جانب تھا۔ فطرت سے محبت و وابستگی ان کی بیشتر نظموں میں واضح طور پر نظر آتی ہے، نیز حسن و عشق کے بیان میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ برسات کی ایک شام، پیغمبر فطرت، برسات کی شفق، شب ماہ، البیلی صبح اور بدلی کا چاند وغیرہ ان کی مشہور رومانوی نظمیں ہیں۔ایک بند ملاحظہ ہو جو ان کی رومانویت کا غماض ہے۔

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے[1]

اردو ادب کے دوسرے شعراء اور رومانویت

حفیظ جالندھری کی شاعری میں رومانویت کے واضح اثرات نہایت آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے ہندستان کے دیہات اور دیہی زندگی کی عکاسی اپنی نظموں کے توسط سے کی ہے۔ حفیظ کی زبان سادہ ہے مگر لفظوں کو برتنے کے ہنر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔اور ان کا ہنر ان کی شاعری میں لطافت و حلاوت اور شیرینی کا موجب ہوتا ہے۔ جلوہ و سحر، برسات کی تاروں بھری رات، راوی میں کشتی، شام رنگین، سچی بسنت، صبح و شام کہسار وغیرہ ان کی رومانوی نظمیں ہیں۔ مذکورہ شعرا کے علاوہ شاغر نظامی، روش صدیقی، اختر انصاری، احسان دانش، عظمت اللہ، حامد اللہ افسر وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں رومانوی عنصر کو پیش کیا۔ فکری و فنی دونوں سطحوں پر ان شعرا کے یہاں رومانویت کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ رومانوی تحریک کے فروغ کے ساتھ اردو شاعری کا مزاج ہی رومانوی ہو گیا۔ گو بہت سے شعراء کلاسیکی انداز کی طرف بھی مڑے لیکن وہ بھی رومانویت کے اثر سے نہ بچ سکے۔ مولانا حسرت موہانی اپنی غزل گوئی کی منزل تک رومانویت کے راستے پہنچے تھے۔

رومانوی تحریک اور اردو نثر

اردو شاعری کی طرح اردو نثر میں بھی رومانویت کا عکس صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ افسانے، ناول کے علاوہ تنقیدی غیر تنقیدی مضامین اور خطوط میں بھی رومانوی انداز اور اسلوب کو برتا گیا۔ اس دور کے دوسرے نثر نگاروں کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد بھی رومانویت سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ آزاد کا نثری اسلوب، تخیل کی فراوانی، جذباتی وفور اور رومانی انانیت سے عبارت ہے۔ غبار خاطر کے خطوط میں ان کا شگفتہ اور دلنشیں انداز ان کے رومانوی فطرت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی نثر میں حکمت اور فلسفے کی بوجھل اصطلاحات کا بکثرت استعمال کیا ہے لیکن ان کے منفرد اور رومانوی اسلوب کے باعث یہ بوجھل اصطلاحات ذہن پر گراں نہیں گزرتیں۔

---

[1] (عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر، کلیات جوش ملیح آبادی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۳۷)

ان کی نثر میں ثقالت کے باوجود روانی و برجستگی ہے۔ آزاد کا یہی اسلوب میں آج بھی انہیں اہمیت کا حامل بناتا ہے۔

اردو کے ابتدائی افسانے رومانوی طرز میں رقم کیے گئے۔ پریم چند کے اولین افسانوں پر بھی رومانویت کا گہرا اثر ہے۔ ''سوز وطن'' کے افسانوں میں پریم چند کا رومانوی اسلوب ان کے رومانوی ذہن کا کھلا ثبوت ہے۔ لیکن بعد میں پریم چند نے ارضی اور دیہی حقیقت نگاری کو اپنا مسلک بنالیا اور خود کو رومانویت سے الگ کر لیا۔ پریم چند کے ایک ہمعصر سجاد حیدر یلدرم کی پوری فکر پر رومانویت غالب ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا ارضی نہیں بلکہ ماورائی ہے۔ وہ رومانوی اور جمالیاتی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ ان کے افسانوں سے قاری اپنی جذباتی تسکین کا سامان تو تلاش کر لیتا ہے مگر حقیقی دنیا سے اس کا واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ قاری کو ایک خیالی جہان کی سیر کراتے ہیں جس میں حسن و عشق اور قدرتی مناظر کی فراوانی ہے۔ حضرت دل کی سوانح عمری، حکایت لیلیٰ مجنوں، خارستان و قاضی عبد الغفار کی رومانویت اسی دور کے دوسرے رومانوی ادیبوں سے منفرد ہے۔ ان کے مختصر ناولوں میں محض حسن و عشق اور خیالی دنیا کا عکس ہی نظر نہیں آتا بلکہ ان کے عہد کے معاشرتی حالات اور عورتوں کے مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حقیقت و رومانویت کا جو امتزاج، ان کے ہاں نظر آتا ہے وہ اس دور کے دوسرے لکھنے والوں کے ہاں مفقود ہے۔ ان کی زبان میں شعریت کے ساتھ ساتھ سلاست و روانی بھی موجود ہے۔ ان کی تخلیقات لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری'' کو مختصر ناولوں یا ناولوں کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔

نیاز فتح پوری افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ادبی صحافی بھی تھے۔ حکمت و فلسفے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں کے افسانوں کے علاوہ جنسیات اور فلسفے پر بھی کتابیں رقم کی ہیں۔ ان کے افسانوں پر یلدرم کا گہرا اثر ہے۔ ان کی کہانیوں کی پوری فضا یلدرم سے مستعار محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کوئی نئی راہ تلاش نہیں کی۔ دراصل نیاز فتح پوری کی شناخت کا ذریعہ ان کا اسلوب ہے۔ وہ اپنے افسانوں کی زبان کو اتنا دلنشین بنا دیتے ہیں کہ قاری واقعات کے بجائے اسی میں کھو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں شاعر کا انجام، شہاب کی سر گزشت، پڑپڑ اور سائیکی، قلو پطرہ کی ایک رات، زائر محبت، حمرا کا گلاب وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔

حجاب امتیاز علی نے ہلکے پھلکے رومانی افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں عالمانہ اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے بجائے معصوم و پاکیزہ جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ یہ معصوم و پاکیزہ جذبے ان کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ ہیں۔ ان کے افسانے مختصر ہوتے ہیں۔ وہ سیدھے سادھے الفاظ میں کہانی کو بیان کر دیتی ہیں۔ اور ان میں کہیں کسی قسم کا پیچ و خم نہیں ہوتا۔ ان کی کہانیاں عشق و محبت کے تخیلاتی جہان سے سروکار رکھتی ہیں۔ اس میں ارضیت و حقیقت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کا بیان وہ بڑی دلچسپی سے کرتی ہیں۔ صنوبر کے سائے تھے، خلوت کی انجمن، اور نغمات موت ان کی رومانوی فکر کو آشکار کرتے ہیں۔ خلیقی، مجنوں گورکھپوری، ن۔ اکبر آبادی اور مرزا ادیب نے بھی اس دور میں افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کی پوری فضا پر رومانویت کا خاصا اثر ہے۔ مذکورہ تمام کے انسانوں میں جذبات کی فراوانی اور خیالی جہان کی سیر کے ساتھ ساتھ حقیقت وارضیت کا حسن بھی شامل ہے۔ ان تمام لکھنے والوں نے حسن و عشق کو بنیاد بنا کر افسانے لکھے، نیز ان تمام حضرات میں ایک صفت قدرے مشترک یہ ہے کہ مناظر فطرت کے بیان میں ان حضرات کو خاصی دلچسپی رہی ہے اور جس کے بیان میں وہ اپنا سارا زور صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل ہونے کے باعث وہ مسرت کو ہی اپنا نقطہ نظر بناتے ہیں۔ اور اسی پیمانے پر فن پاروں کو پرکھتے ہیں۔ محاسن کلام غالب میں انھوں نے غالب کے فن پر ایک

نئے زاویئے سے روشنی ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسرا دیوان غالب بجنوری کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا۔ مہدی افادی اور سجاد انصاری کے مضامین میں بھی جذبات کی وارفتگی، نسائی حسن کی دل آویز یاں اور تیل کی اونچی پرواز ملتی ہے۔ ان حضرات کا اسلوب بھی جذبے کی تپش اور شعریت سے مملو ہے۔

حوالہ جات